Date of Publication: 09-11-2013

PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 10-11 Nov. 2013
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C) 160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

15-21 November 2013

Issue: 43, Vol.: 72

۱۵ تا ۲۱ نومبر ۲۰۱۳ء

شمارہ نمبر: ۴۳، جلد نمبر: ۷۲

مولانا آزاد اور اردو زبان کا تحفظ

ڈاکٹر مظفر حسین سید (2911، سرسید روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 110002)
E-mail: syedmh92@yahoo.com

امام الہند مولانا احمد محی الدین المعروف بہ مولانا ابوالکلام آزاد، ایک نادر روزگار، نابغہ شخصیت، اپنے علم و فضیلت اور زبردست قوت حافظہ کی بنیاد پر نابغۂ زمانہ میں شمار کیے جانے کا استحقاق رکھتے ہیں۔ ان کی انھی خصوصیات کے سبب علامہ شبلی نعمانی ان کے گرویدہ، مولانا عبدالماجد دریابادی اور علامہ نیاز فتح پوری ان پر فریفتہ اور مولانا غلام رسول مہر، شیخ اکرام و شورش کاشمیری ان کے عقیدت مند تھے۔ یہ تو صرف چند قد آور ہستیاں ہیں، ورنہ مولانا ابوالکلام آزاد کے مداحوں کی فہرست خاصی طویل ہے، کہ ان کی شخصیت سب سے منفرد اور بلند و بالا تھی۔ بہ زبان شعر:

بڑی مدت میں ساقی بھیجتا ہے ایسا مستانہ
بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستور مے خانہ

مولانا کے فکر و فن پر خامہ فرسائی کرنا کارِ دارد ہے، کیوں کہ ان کی حیات و خدمات پر تصنیف شدہ کتب، نیز مقالات

آج ہندوستان جنت نشان میں اردو کا وجود مولانا ابوالکلام آزاد کی جہد مسلسل اور تاریخی حیثیت کی حامل ان خدمات کا رہین منت ہے، جن کا بسط نصف صدی سے زائد مدت کو محیط ہے۔ پابندیٔ وقت اور تنگیٔ صفحات کے سبب تفصیل کی گنجائش نہیں، لہٰذا اشارتاً عرض ہے کہ اردو کی مخالفت حصولِ آزادی، تقسیم وطن اور قیامِ پاکستان سے بہت پہلے، کوئی پون صدی قبل شروع ہو چکی تھی۔ یہ انکشاف چشم کشا ہوگا کہ اولین جنگ آزادی کے محض دس برس بعد یعنی ۱۸۶۷ء میں ہی بنارس میں اردو کے خلاف پہلا فتنہ پیدا ہو گیا تھا، جب بابو شیو پرساد کی قیادت میں ہندی کی وکالت اور درحقیقت اردو کی مخالفت میں شروع ہونے والی جنگ کا پہلا بگل بجا تھا۔ اس وقت سرسید نے بے قرار ہو کر اپنے رفیقِ خاص نواب محسن الملک کو لکھا تھا کہ "بابو شیو پرساد کی تحریک سے عموماً ہندوؤں میں یہ جوش آیا ہے کہ زبانِ اردو اور خطِ فارسی کو جو مسلمانوں کی نشانی ہے، اُسے مٹا دیا جائے"۔

اس کے بعد یہ طوفان تھما نہیں، اگرچہ عرصۂ دراز تک جلسے جلوس، نیز اخبارات کی زبان اردو ہی رہی اور تمام تر سیاسی و مذہبی تحریکات بشمول ہندو مہاسبھا اور آریہ سماج کی تشہیر و تبلیغ کا ذریعہ بھی اردو ہی رہی، لیکن ہندی پرستی کی تحریک بڑی خاموشی مگر جوش و جذبے کے ساتھ جاری رہی اور بیسویں صدی کے چوتھے عشرے تک آتے آتے اس نے ایک طوفانی رخ اختیار کر لیا، اور اس کے سرخیلوں میں صرف ہندو مہاسبھا ہی نہیں، کچھ کانگریسی بھی زیرِ نقاب شامل تھے۔ سیٹھ گووند داس اور پرشوتم داس ٹنڈن جیسے لوگ پیش پیش تھے، جنھیں سیکولر کانگریس کی اعلا قیادت کی خاموش حمایت حاصل تھی۔ یہ سازش بدیہی طور پر اس وقت سامنے آئی جب اعلانِ آزادی سے قبل ہی کانگریس کی مجلس عمل نے مستقبل کے ہندوستان کی زبان کے طور پر اردو ہی نہیں، ہندوستانی کو بھی مسترد کیا اور ہندی کو



بلا شرکتِ غیرے آزاد ملک کی سرکاری زبان قرار دیا۔ یہ فیصلہ محض ایک رائے کی اکثریت سے ہوا، اور یہ سانحہ اتفاقاً اس وقت کے صدر ٹنڈن کی تھی۔ مولانا آزاد موجود تھے، مگر خاموش، بے بس تماشائی تھے، اس لیے کہ اکثریت ان کے خلاف تھی۔ حتیٰ کہ مہاتما گاندھی کی اس تجویز کو بھی یک قلم مسترد کر دیا گیا کہ آئندہ ہندوستان کی زبان ہندوستانی ہو، جسے بہ دو رسم الخط فارسی و دیوناگری میں لکھا جائے، الفاظ اردو اور ہندی دونوں کے ہوں، اور آسان ہوں۔ اردو سے تو اعراض تھا ہی، اس کی ضد میں 'ہندوستانی' کو بھی درکنار کر دیا گیا تھا۔

اس وقت تک مولانا آزاد کی تمام تر مساعی جمیلہ کا محور یہ تھا کہ اردو جیسی متمول اور ہمہ گیر زبان کو آزاد ہندوستان کی قومی زبان قرار دیا جائے، کیوں کہ ان کی رائے میں یہی واحد ملک گیر زبان تھی، اور ہندی کا دائرہ اس کے مقابلے میں محدود تھا۔ حریت کے ترانے اردو میں گائے جا رہے تھے اور انقلاب کے نعرے اردو میں لگ رہے تھے۔ اس میدان میں ہندی اس کی ہمسر کہیں سے کہیں تک نہ تھی۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پنڈت نہرو بھی قلبی طور پر ہندی کے نہیں، اردو کے حامی تھے، لیکن ان جیسا بلند قد قائد بھی اپنی بات کو موثر طریقے سے پیش کر سکا اور نہ ہی عصبیت کی شکار اکثریت سے اسے تسلیم کرا سکا۔

ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کے بعد اردو کا مقدمہ کافی کمزور ہو گیا تھا، اگرچہ دوسری ستم ظریفی یہ تھی کہ اردو بے چاری پاکستان کے پانچوں صوبوں میں سے کسی کی زبان نہیں تھی، باقی چار میں آج بھی نہیں، ماسوا مہاجرین۔ محض رابطے کی زبان ہے، اور صرف قانون کے زور پر ملک کی قومی زبان قرار پائی ہے۔

آزادی کے بعد مولانا آزاد نے اردو کے حق کی جنگ از سر نو شروع کی۔ انھوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ ہندی کے منصب و مرتبے پر حرف نہ لاتے ہوئے اردو کے جائز حق کا مطالبہ کیا جائے اور اس کو وہ مقام دلایا جائے، جس کی وہ سزاوار ہے۔

اس شمارے میں

مولانا ابوالکلام آزاد کی 125 ویں یوم ولادت پر دو خاص تحریریں۔ 'مولانا آزاد اور اردو زبان کا تحفظ' (ڈاکٹر مظفر حسین سید) اور مولانا آزاد کے ایک ہم عصر مولانا دریابادی (قسط وار) (اسم کا بیانی) ملاحظہ فرمائیں۔ (ادارہ)

سے کتب خانے معمور ہیں۔ اسی سبب اس ناچیز نے بڑی تلاش اور جرأت کے طفیل ایک ایسے موضوع کا انتخاب کیا ہے، جس پر بہ معلوم وجوہ کی بنا پر ماہرین آزادیات نے اپنے قلم کے جوہر دکھانے سے گریز کیا ہے، جبکہ ان کی نثر، ان کے اسلوب، نیز ان کی ادبی خدمات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس عاجز قلم کی رائے میں اردو کے تعلق سے دو باتیں اہم ہیں۔ اوّل زبان، دوم ادب۔ راقم الحروف نے اردو زبان کے تئیں مولانا آزاد کی ہمہ گیر جرأت مندانہ، بے مثل اور تاریخی خدمات کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، اس موضوع پر بہ مشکل دو مضامین دستیاب ہو سکے، نیز مستقل تصنیف ایک بھی نہیں۔

اس ناچیز مقالہ نگار کی کمترین رائے میں زبان کا درجہ اوّل ہے، اور ادب کا دوم۔ اگر زبان کا وجود ہی باقی نہ رہے، یا محض صفحۂ قرطاس پر رہے، حیات عمل سے غائب ہو جائے تو ادب کس کے ذریعے تخلیق ہوگا، اور بالفرض محال ہوا بھی تو اس کا قاری کون ہوگا۔ اگر اردو داں اور اردو خواں ہی نہ رہے تو منظر عام ادب پر خلا ہی خلا ہوگا۔

روایتی طور پر بھی اردو تو تھا ہی۔

یہاں ایک دلچسپ قصہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا۔ آئین ساز اسمبلی میں اردو کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ مولانا آزاد اور ان کے چند ہم خیال اردو کو اس کا جائز حق دلانے کے لیے ہر دلیل اور ہر منطق کو بنیاد بنا رہے تھے، وزیر اعظم پنڈت نہرو بھی شریک بحث تھے، تبھی راجستھان کے قد آور لیڈر سیٹھ گووند داس نے استہزائیہ لہجے میں پنڈت جی سے سوال کیا کہ "اردو کس کی مادری زبان ہے؟" اس سوال کے جواب میں پنڈت نہرو نے کہا کہ اردو میری ماں کی مادری زبان ہے۔ ان کا جواب خود آئینہ ہے، انھوں نے برملا یہ نہیں کہا کہ اردو میری مادری زبان ہے، جبکہ شاید ان کا منشا یہی تھا کہ جو زبان ان کی ماں کی زبان ہے، وہی ان کی مادری زبان ہے۔ تاہم وہ اس حقیقت کا اظہار نہ کرسکے کہ مصلحتیں حاوی تھیں۔ یہ معاملہ تو اس بااختیار وزیر اعظم کا تھا، جو کانگریس کا قد آور ترین رہنما بھی تھا۔ شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ رویہ اس حقیقت کا غماز تھا کہ اردو کے سلسلے میں تقسیم وطن کے سبب کانگریسی قیادت کس حد تک مجبور تھی۔ ویسے کہا بھی جاتا ہے کہ جواہر لال نہرو اردو داں ہونے کے دعویدار تھے، اردو میں ان کے خطوط بھی موجود ہیں، اردو پر انھیں اتنی قدرت حاصل تھی کہ آزادی سے قبل مولانا آزاد کی ہر تقریر و مباحثاتی گفتگو کا انگریزی ترجمہ اکثر وہی کرتے تھے۔ ان کے والد محترم کے بارے میں بھی ایسے تذکرے موجود ہیں کہ وہ اپنا دفتری کام کاج بیشتر اردو میں ہی کرتے تھے۔ مگر غالب کے بقول اب یہ سب دل بہلانے والے خیالات ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

بہرصورت، مولانا آزاد جیسے اردو کے جیالے نے ہمت نہیں ہاری، ان کا معاملہ تو یہ تھا:

تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

مولانا آزاد کی جدوجہد اردو جاری رہی۔ ۱۹۵۳ء میں قومی پارلیمان کے بجٹ اجلاس میں ایک مرتبہ پھر اردو کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ اس وقت اردو کی عداوت اپنے عروج پر تھی، ہندی پرستوں کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مولانا آزاد کے زیر اثر، نہرو جی کی رضامندی سے، اردو کے لیے کوئی خطیر رقم مختص کردی جائے اور کوئی ادارہ منصوبہ اردو کی ترقی کے لیے تشکیل پا جائے۔ دراصل مرکزی حکومت کی دفتری زبان کی حیثیت سے ہندی کی تاج پوشی کے بعد بھی ہندی کے طرفداروں کی تشفی نہیں ہوئی تھی اور وہ اردو کو نیست و نابود کرنے یا کم از کم ملک بدر کرنے کے درپے تھے، ہندی کا معاملہ گرم تھا، اردو کی مخالفت شباب پر تھی، مولانا نے اردو کی حمایت میں لب کھولے تو ان پر ہندی کے ساتھ سوتیلا سلوک کرنے کا الزام عائد کردیا گیا۔ آچاریہ کرپلانی کے اعتراضات کے بعد ہندی کے زبردست حامی اور وکیل سیٹھ گوبند داس، پرشوتم داس ٹنڈن، الگو رائے شاستری اور ونیش پانڈے نے مولانا پر بڑے شدید، رکیک حملے کیے اور گستاخی میں حد سے گزر گئے۔ یہ بات ۲۷ مارچ کی ہے، اس کے بعد ۲۹ مارچ ۱۹۵۳ کو مولانا آزاد نے جوابًا جو تاریخی تقریر کی، وہ خطابت کی مثال تھی، اور بقول شخصے اس کی گونج آج بھی ایوان نمایندگان میں سنائی دیتی ہے۔ مولانا پورے جوش میں تھے۔ سردست ان کی اس طویل تقریر کی چند سطور نقل کی جارہی ہیں۔ مولانا کے الفاظ تھے:

"میری زندگی ایک کھلی کتاب ہے۔ میں بے غرض ہوں، اور جو بے غرض ہوتا ہے وہ بے پناہ ہوجاتا ہے، اور بے پناہ وہ ہوتا ہے، جسے کوئی تلوار کاٹ نہیں سکتی"۔

(بحوالہ 'نگار و نظر' آزاد نمبر)

یہ تقریر پارلیمانی دستاویزات میں درج ہے اور مولانا کے مجموعہ تقاریر میں بھی شامل ہے۔ نیز عبداللطیف اعظمی نے اپنی تصنیف "سفر حسین ابوالکلام آزاد" میں، اس تقریر پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اس دندان شکن جواب کے بعد اردو کے مخالفین کی ہمتیں کسی حد تک پست ہوگئی تھیں۔

مولانا آزاد نے اردو کے مقدمے کو بڑے ہی پرزور، موثر اور مدلل طریقے سے ۱۵ فروری ۱۹۵۸ کو انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام منعقد کل ہند اردو کانفرنس میں پیش کیا تھا۔ اپنی وفات سے محض ایک ہفتہ قبل مولانا نے اس اجلاس میں بڑی وقیع و بسیط تقریر ارشاد فرمائی تھی، جو اس امر کی متقاضی ہے کہ اس کا مکمل متن شامل گفتگو کیا جائے۔ تاہم بہ لحاظ اختصار اس کی صرف چند سطریں حاضر ہیں۔

"ہمیں چالیس سال پہلے زبان کے بارے میں یہ جھگڑا تھا کہ ملک کی زبان کیا ہو۔ جو لوگ اردو کے حامی تھے، وہ چاہتے تھے کہ اردو ملک کی زبان ہو۔ اور جو ہندی کے حامی تھے، ان کی خواہش تھی کہ ہندی ہو۔ اور یہ معاملہ اس وقت گہرائی تک پہنچ گیا تھا، کیوں کہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کی رقیب بن کر کھڑی ہوگئی تھیں۔ ملک آزاد ہوا، دستور ساز اسمبلی میں بحث ہوئی اور اکثریت کے ساتھ ہندی کو ملک کی زبان تسلیم کرلیا گیا، جس کے نتیجے میں اردو کی حیثیت میں ایک بنیادی انقلاب آگیا۔ لیکن اردو کی جو جگہ ہے اسے ملنی چاہیے"۔

(بحوالہ آزاد کی تقریریں، مرتبہ عارف اقبال ۱۹۹۱)

اس کانفرنس میں مولانا آزاد نے اردو کا پرجوش و پرزور دفاع کیا، اس کی مدلل وکالت کی، اور اسی اجلاس میں پنڈت نہرو سے اردو کی حمایت کا واضح اقرار و اعلان بھی کروایا۔ پنڈت نہرو نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا تھا۔ شومی قسمت کہ اردو کی یہ کانفرنس مولانا کی حیات کا آخری احتجاج ثابت ہوئی، جس میں انھوں نے اردو کا مقدمہ پیش کیا تھا۔

اردو کے تحفظ و ترقی کے لیے مولانا آزاد کی مساعی جلیلہ بڑی حد تک اردو اداروں کی بقا کی ضمانت، ان کی حیات دوام اور ان کے تحفظ کے مستقل اہتمام سے عبارت تھیں۔ ملک کے طول و عرض میں قائم دینی مدارس مع دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء، دارالمصنفین اعظم گڑھ، دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد، رضا لائبریری رام پور، خدا بخش لائبریری پٹنہ، کتب خانہ ٹونک اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے علاوہ انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی بقا، نشوونما، فروغ اور پائیدار تحفظ کے لیے بڑے منصوبہ بند، دانش ورانہ اور دور رس نتائج کے حامل اقدام کیے، جن کی تفصیل قدرے اختصار کے ساتھ یہاں پیش ہے۔

آزادی کے بعد دارالمصنفین اعظم گڑھ پر بے بسی کا وقت پڑا تو اس کا قائم رہنا ہی دشوار نظر آنے لگا۔ اس وقت مولانا آزاد مسیحا بن کر سامنے آئے، انھوں نے سرکاری سطح پر ایک خطیر رقم اس ادارے کے لیے منظور فرمائی۔ ان کے اس فیصلے کو پنڈت نہرو کی مکمل حمایت حاصل تھی، اس کے باوجود انھیں اس سلسلے میں قومی پارلیمان میں جواب دہی کا سامنا کرنا پڑا۔ مجلہ 'معارف' کی ایک تحریر اس کی شاہد ہے:

"مولانا ابوالکلام آزاد نے فی الحال ایک سال کے لیے ساٹھ ہزار کی گراں قدر رقم بطور امداد منظور فرمائی ہے اور پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کی پوری تائید کی ہے"۔

(بحوالہ 'معارف' ماہ اگست ۱۹۵۳ء)

اسی طرح جب مسلم دشمن اور اردو مخالف عناصر کی ریشہ دوانیوں کے سبب دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد کا وجود ہی ناپید ہونے والا تھا تو مولانا نے بروقت اس کی دلداری کی۔ اس کی شہادت مولانا عبدالماجد دریابادی نے فراہم کی، ان کے الفاظ میں:

"یاروں نے کیا کوئی کسر ادارے کے بند کرادینے کی اٹھا رکھی تھی، ادارہ مسلمانوں کا مخصوص کام کر رہا ہے، فرقہ وارانہ ہے، سیکولر حکومت میں اس کا کیا کام۔ اسے فورًا اٹھا دینا چاہیے۔ قریب تھا کہ فرمان قضا اس مضمون کا شائع ہوجائے، لیکن خدا غریق رحمت کرے وزیر تعلیمات ہند مولانا ابوالکلام آزاد کو کہ ان کی مسیحا نفسی نے اسے از سر نو زندگی عطا کی"۔

(بحوالہ نقوش کا ادب عالیہ اور سرور کی قسط چہارم)

درحقیقت مذکورہ بالا تمام ادارے مولانا آزاد کے بروقت و باضابطہ اقدام کے طفیل نہ صرف برقرار رہے بلکہ اب بھی قائم اور فروغ پذیر ہیں۔

یہ تمام امور مدلل، مفصل اور باثبوت گفتگو کے متقاضی ہیں لیکن اس مضمون کا اختصار راقم کو پابند کرتا ہے کہ وہ صرف اشاروں پر اکتفا کرے۔ بہرکیف جامع ثبوت کے طور پر مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی ایک تقریر کا حوالہ دینا لازم ہے۔ انھوں نے فرمایا تھا:

"مولانا آزاد نے آزادی کے بعد نہایت نامساعد حالات میں بھی بھارت میں مسلمانوں اور اسلام کی خدمت بڑی جرأت، دلیری، ہمت اور بہادری کے ساتھ کی"۔

(بحوالہ تقریر مولانا سعید احمد اکبرآبادی، کراچی، ۱۹۸۸ء، مطبوعہ اخبارات کراچی)

مولانا آزاد کے ذریعے مذکورہ بالا اداروں کی امداد اور سرپرستی کا ذکر ابوسلمان شاہجہانپوری نے اپنی تصنیف "اردو کی ترقی میں مولانا آزاد کا حصہ" میں تفصیل سے فرمایا ہے، ان کا ایک مختصر اقتباس پیش ہے:

"حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے یہ تمام اقدامات و مساعی علوم و فنون سے ان کی دلی وابستگی کے عناوین اور اردو کی ترقی کے لیے بنیادی سروسامان کی حیثیت رکھتے ہیں"۔

(اشاعت اول، ناشر، انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۸۸ء)

انجمن ترقی اردو (ہند) سے مولانا آزاد کی وابستگی، ذاتی اور جذباتی نوعیت کی تھی۔ ۱۹۰۳ء میں انجمن کے قیام کے دن سے اپنے وقت آخر تک وہ اس تنظیم سے مستقلًا وابستہ رہے۔ انھوں نے اپنے اخبار 'لسان الصدق' کو عملًا انجمن کا ترجمان بنا دیا تھا۔ اس کے بعد بھی مسلسل وہ اس ادارے کی سرپرستی کرتے رہے۔ آزادی کے بعد جب انجمن کسمپرسی و غیر یقینی حالات کا شکار ہوئی تو مولانا نے نہ صرف وزارت تعلیم سے اس کی عمارت کے لیے ایک خطیر رقم منظور فرمائی بلکہ اس کی مستقل سالانہ امداد کا اہتمام بھی کروایا۔ انھوں نے ذاتی دلچسپی لے کر اور کڑی نگرانی کرا کے بابائے اردو مولوی عبدالحق کو انجمن کی جملہ املاک، نیز کتابوں کا ذخیرہ پاکستان منتقل کرنے سے باز رکھا اور اس کا صدر دفتر دہلی سے علی گڑھ منتقل کروایا، پھر انجمن کے پرچم تلے کل ہند اردو کانفرنس منعقد کرائی، جس کا ذکر سطور بالا میں کیا جاچکا ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی بھی مولانا آزاد کی رہین احسان ہے۔ وہ بھی از بانیان جامعہ تھے، روز اول سے انھوں نے اس ادارے کی رہبری و سرپرستی کی۔ تقسیم ہند کے وقت جامعہ قرول باغ، دہلی میں تھی، وہاں اس کے وجود کو خطرہ لاحق ہوا تو مولانا کی سرپرستی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی قیادت میں جامعہ اوکھلا کی بستی میں منتقل کی گئی، جہاں آج وہ ایک ذی شان دانشگاہ کی شکل میں قائم و رو بہ عروج ہے۔ مولانا کے ہی ایما پر جامعہ کا ذریعہ تعلیم اردو کو قرار دیا گیا۔ یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نام بھی مولانا ہی کے ذہن کی اختراع ہے۔ انھوں نے جامعہ کے بنیادی نام 'نیشنل مسلم یونیورسٹی' کا عربی ترجمہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کردیا اور پھر یہی نام رائج ہوگیا۔ اس کا ذکر سید سلیمان ندوی نے اپنی تصنیف "حیات شبلی" میں کیا ہے۔

علی گڑھ اور مولانا آزاد کا رشتہ عجیب و غریب نوعیت کا ہے۔ اپنی ذہنی نشوونما کے ابتدائی دور میں آزاد، سرسید کی فکر اور ان کی تحریروں سے از حد متاثر تھے۔ لیکن بعد میں انھیں سرسید سے اختلاف ہوگیا اور وہ سرسید کے سیاسی موقف کے ناقد ہوگئے۔ لیکن یہ سرسید کی رحلت کے بعد کی بات ہے۔ اس کے بعد جب بیسویں صدی کے اوائل میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کی مہم شروع ہوئی تو مولانا آزاد اگرچہ اس کے قیام کے حامی تھے، انھوں نے اس کی جدوجہد میں عملی حصہ بھی لیا، لیکن جس شکل میں یونیورسٹی قائم ہورہی تھی، وہ انھیں قبول نہ تھی۔ پھر حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ وہ علی گڑھ سے دور ہوتے گئے۔ یہ تمام امور تفصیلی گفتگو کے متقاضی ہیں لیکن فی الوقت یہ ہمارا موضوع نہیں۔ تاہم بالاختصار یہ کہنا لازم ہے کہ جب تقسیم وطن اور حصول آزادی کے بعد دیگر تمام مسلم اداروں کی طرح مسلم یونیورسٹی کی بقا اور اس کے وجود کو بھی شدید خطرات لاحق ہوئے، تب مولانا آزاد نے اپنے تمام تر نظریاتی و فکری اختلاف اور ماضی کی بدمزگیوں کے باوجود اس دانش گاہ کی سرپرستی فرمائی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین بھی مسلم یونیورسٹی کے حامیوں میں نہ تھے، لیکن مولانا آزاد نے انھیں بہ اصرار بلکہ ذاتی

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

ترچناپلی میں اردو

علیم صبا نویدی
192، ٹرپلی کین ہائی روڈ، سکنڈ فلور، فلیٹ نمبر 16
رائس منڈی اسٹریٹ، چینئی-600005

ہماری اردو زبان ایک مخلوط زبان ہے، جس طرح اردو مشرق و مغرب کی زبانوں کا مجموعہ ہے۔ اسی طرح شہر ترچناپلی بھی تین قدیم اور ممتاز تہذیبوں کا سنگم ہے۔ ایک طرف یہ شہر تمل کی قدیم تہذیب و ثقافت کا مرکز ہے، تو دوسری جانب عیسائی اور مغربی تہذیب نے یہاں اپنے قدم جما کر اپنے مشن اور مقاصد کی اشاعت کے لیے راہ ہموار کرلی۔ اس پر مستزاد یہ کہ صدیوں سے اس شہر کو اردو زبان، اردو تہذیب اور اردو ثقافت نے جلا بخشی ہے۔ ہمارے اولیا و صوفیائے کرام نے جن میں حضرت طبل عالم نتہر شاہ ولی اور ان کے رفقا نمایاں ہیں، اس سرزمین کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے روحانیت کا مرکز بنادیا اور خصوصاً والا جاہی خاندان کے حکمرانوں نے ترچناپلی کو اپنا دارالحکومت بنا کر تاریخ میں اسے ایک ممتاز اور بلند مرتبے کا حامل بنادیا۔

تمل ناڈو میں اردو کے تین قدیم اور بڑے مرکز رہے ہیں: آرکاٹ، ترچناپلی اور مدراس۔ یہاں صرف ترچناپلی میں اردو کی نشوونما اور اردو ادب کی ترویج و اشاعت کا ایک خاکہ پیش کیا جارہا ہے۔

ترچناپلی میں اردو کی قدامت کا اگر تذکرہ کیا جائے تو بہ قول پروفیسر حسرت سہروردی، علاء الدین خلجی اور ملک کافور کے عہد سے اردو کے ابتدائی نقوش کا یہیں پہچان پاتا ہے۔ مدورائی تک علاء الدین خلجی اور ملک کافور کی فتوحات کی داستانیں تاریخ سنا رہی ہے۔

میں نے پروفیسر حسرت کی والدہ کی زبانی امیر خسرو کے دوہے کا ایک مصرعہ سنا تھا:

وہی دیکھی اگر دو دیکھا دیکھی ترچناپلی

اس دوہے کے دوسرے مصرعے کی مجھے آج تک تلاش ہے۔ بہرحال اس مصرعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ امیر خسرو نے جن کا تعلق خلجی کے دربار سے تھا، ترچناپلی دیکھی تھی۔ تاریخ سے یہ واضح ہے کہ اردو کا قافلہ مدورائی تک ترچناپلی کی راہ سے گزرا ہے۔ عہد والا جاہی کی تاریخ میں جہاں اس شہر کے دروازوں کے مختلف نام تھے، ان میں دہلی دروازہ اور مدورا دروازہ کے نام قابل ذکر ہیں اور آج بہ طور یادگار اس شہر کی ایک شاہراہ کا نام مدورائی روڈ رہ گیا ہے۔

ترچناپلی میں جن مشاہیر صوفیا نے اردو کو اپنے دامن میں پناہ دی ان میں شاہ تسلیم اللہ کا نام کافی ممتاز مرتبے کا حامل ہے۔ شاہ صاحب کا اردو دیوان یہاں کی تاریخ میں اولین منظوم کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ آج ہندو پاک کی مختلف یونیورسٹیوں میں شاہ صاحب کے اس شاہکار پر کافی کام ہوچکا ہے لیکن تعجب اس بات کا ہے کہ بعض محققین نے اس کو آندھرا پردیش کا کہا ہے۔ تاریخی شواہد سے یہ پتا چلتا ہے کہ مولانا باقر آگاہ نے حصول علم کی خاطر ایک عرصے تک ترچناپلی میں قیام کیا تھا اور حضرت شاہ رحمت اللہ سے (جن کا مزار امیر مسجد کے روبرو ہے) علوم ظاہری اور باطنی میں فیض حاصل کیا تھا۔ مولانا باقر آگاہ کو جنوبی ہند میں اردو نثر کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آگاہ کی اردو نثر میں نمایاں ترقی اور نکھار ترچناپلی کے قیام کے بعد ہی آیا ہے۔

مولانا آگاہ کے بعد مولوی محمد غوث کی علمی خدمات قابل ذکر ہیں۔ مولوی موصوف عربی، فارسی اور اردو کے بیند عالم تھے۔ ان کی حسب ذیل تصانیف مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوئی ہیں: محاسن الاخلاق، احسن المواعظ، رحمت الرحمن، روضۃ الجنان، مطلع البدر، تفسیر الامیر اور عمدۃ البیان فی احسان۔

جہاں تک ترچناپلی میں اردو شعر و ادب کی نشوونما کا تعلق ہے، نواب عمدۃ الامرا امتیاز والا جاہ دوم کا تذکرہ نہایت ضروری ہے۔ ۱۸۰۱ میں ممتاز کا انتقال ہوگیا، ان کی زندگی تک ترچناپلی کا تمام علاقہ ان کے زیر نگیں رہا۔ ۱۸۰۲ میں نواب عظیم الدولہ کی معصومیت کی وجہ سے انگریزوں نے یہ تمام علاقہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ یہاں کے تاریخی محل میں سنگ سفید پر ایک انگریزی عبارت ہمیں آج بھی اپنی داستان غم سناتی ہے، جس میں ۱۸۰۲ کندہ ہے۔ ممتاز کی عمر کا زیادہ تر حصہ ترچناپلی میں بسر ہوا۔ یہاں کے علما و فضلا سے انھوں نے فیض حاصل کیا، بعد میں مولانا باقر آگاہ کی وجہ سے ان کا شعری ذوق خوب نکھرا۔ بہ طور نمونہ یہاں ان کے غیر مطبوعہ کلام سے تین شعر پیش ہیں:

غزلوں میں کس لیے جوش سے پیار شیں کیا تھا
خزاں کو اب جو میں رونق بہار میں کیا تھا
ترے ہی واسطے آئے عدم سے ہم یاں تک
وگرنہ ہستی ناپائیدار میں کیا تھا

یہ شعر بھی ملاحظہ فرمائیے:

شراب ہوگئی جاتا ہے جو زندگی
ہمارے دل سے جوانی کی آرزو نہ گئی

نواب ممتاز کا انتقال مدراس میں ہوا۔ ترچناپلی میں درگاہ نتہر ولی کے احاطے میں ان کے خاندانی مقبرے کے اندر ان کی تدفین عمل میں آئی۔

والا جاہی دور میں ترچناپلی نے اردو زبان و ادب اور ثقافت کے قابل المثال کارنامے انجام دیے ہیں۔ والا جاہی دور کے بعد یہاں کی لٹریری سوسائٹی، اردو مجلس اور دیگر انجمنوں کے علاوہ جمال محمد کالج کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ جب سے جمال محمد کالج قائم ہوا ہے، اُس وقت سے آج تک اس کالج کا قابل قدر کارنامہ یہ رہا ہے کہ یہاں غیر اردو داں طلبہ بہت ذوق شوق سے اردو پڑھتے ہیں۔ یہاں کا عربی مدرسہ مظہر العلوم جس کے بانی مولانا عبدالسلام مرحوم ہیں، اس مدرسے میں بھی اردو کی تعلیم کا انتظام ہے۔ پرنس آف آرکاٹ اللہ رحمت کے یہاں چار مساجد ہیں، ان میں تین مساجد میں پانچ مدارس ہیں، جہاں ناظرہ قرآن اور دینیات کے ساتھ اردو کی تدریس کا بھی خاص اہتمام ہے۔

یہاں ابتدا ہی سے اردو کو زندگی اور توانائی ملی ہے۔ یہاں اردو کو زندگی بخشنے والوں میں مجاہد آزادی مولانا سید مرتضیٰ مرحوم، ڈاکٹر صفی اللہ مرحوم، جناب عبدالوہاب عرف جانی بھائی مرحوم، ڈاکٹر امیر الدین، قاضی عبدالغنی، پروفیسر حسرت سہروردی اور انجمن خواتین اسلام قابل ذکر ہیں جن کی اردو خدمات کو کوئی بھی محقق نظر انداز نہیں کرسکتا۔

ترچناپلی میں انجمن ترقی اردو (ہند) کی شاخ بھی ایک فعال ادارے کے طور پر کام کررہی ہے۔

شہر مدراس میں ڈاکٹر حسن نذیر محمد اور نواب اکرام محمود نے اردو تحریک کو زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر نذیر محمد اور نواب اکرام محمود کے بعد یہ تحریک علما ہاتھوں میں پھنس کر دم توڑ گئی ہے۔ مگر ترچناپلی میں ڈاکٹر احمد ندیم اس کو توانائی بخشنے میں ہنوز کوشاں ہیں۔

فی الحال اردو کی بقا اور اس کی ترویج و اشاعت کے مسائل ہی ہمارے پیش نظر نہیں ہیں بلکہ اردو ادب کا مستقبل بھی تمل ناڈو میں تاریک نظر آرہا ہے، اس کی طرف بھی ہمیں توجہ کرنی ہے۔ دو لسانی فارمولا اردو کے زوال کا سبب بنا ہے، اس کے لیے حکومت کے دروازے پر بہت سے ارباب علم و ادب اور تمل ناڈو کے معزز اور معتمد حضرات نے دستک دی ہے۔ اس کے علاوہ اردو داں طبقے کے دلوں سے اردو کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں انھیں دور کرنے کے ذرائع تلاش کرنا ہے۔ اردو اکادمی کی زندگی کا مسئلہ بھی وقت کی نہایت اہم ضرورت ہے۔ یوں تو ابتدا ہی سے اردو کا ہر چھوٹا بڑا ادارہ حکومت کی توجہ اکادمی کے قیام کی طرف مبذول کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ اسمبلی میں بھی اردو اکادمی کے لیے آواز بلند کی گئی۔ یقین ہے کہ بہت جلد تمل ناڈو کے وزیر اعلا کی نظر التفات اس جانب اٹھے گی اور اردو داں طبقے کی اٹھائی ہوئی آواز ضرور پھول پھل لائے گی۔

●●●

ترچناپلی میں ابتدا ہی سے اردو کو زندگی اور توانائی ملی ہے۔ یہاں اردو کو زندگی بخشنے والوں میں مجاہد آزادی مولانا سید مرتضیٰ مرحوم، ڈاکٹر صفی اللہ مرحوم، جناب عبدالوہاب عرف جانی بھائی مرحوم، ڈاکٹر امیر الدین، قاضی عبدالغنی، پروفیسر حسرت سہروردی اور انجمن خواتین اسلام قابل ذکر ہیں جن کی اردو خدمات کو کوئی بھی محقق نظر انداز نہیں کرسکتا۔

اردو دُنیا

سیاسی پارٹیاں اردو کے مطالبے کو انتخابی منشور میں شامل کریں

نئی دہلی (۱۷ اکتوبر)۔ اردو کی معروف اور سرکردہ شخصیات نے حال ہی میں منعقدہ میٹنگ میں ایک تجویز پاس کرکے دہلی کی تمام سیاسی پارٹیوں بالخصوص کانگریس، بی جے پی اور عام آدمی پارٹی سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ تمام سیاسی پارٹیاں آئندہ الیکشن کے لیے جاری ہونے والے اپنے مینی فیسٹو میں اردو کے آئینی و جمہوری حقوق سے متعلق حسب ذیل تین اہم مطالبات کو شامل کریں اور اقتدار میں آنے کی صورت میں ان پر عمل درآمد کا اعادہ ظاہر کریں۔ وہ مطالبات یہ ہیں: (۱) دہلی میں چوں کہ اردو اور پنجابی دوسری سرکاری زبانیں ہیں اس لیے ہندی اور انگریزی کے ساتھ اردو اور پنجابی کی تعلیم کو بھی تمام سرکاری اسکولوں میں ثانوی درجات تک تعلیمی نظام کا لازمی حصہ بنایا جائے۔ (۲) سہ لسانی فارمولے کے تحت ہندی اور انگریزی کے ساتھ تیسری زبان کے طور پر اردو یا پنجابی میں سے کسی ایک زبان کی تعلیم کو ثانوی درجات تک لازمی قرار دیا جائے۔ (۳) اردو اور پنجابی چوں کہ دہلی کی دوسری سرکاری زبانیں ہیں اس لیے دہلی سرکار کے تمام محکمے میں ملازمت کی اسامیوں کے لیے اردو اور پنجابی میں سے کسی ایک زبان سے واقفیت اور ثانوی درجات تک کی تعلیمی ڈگری کو لازمی قرار دیا جائے۔ اس موقع پر ڈاکٹر انور پاشا کے علاوہ پروفیسر شفیق اللہ، پروفیسر عبدالحق، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر نعمان خان، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر ارتضیٰ کریم، پروفیسر اعجاز علی ارشد، پروفیسر شاہد حسین اور جناب فیروز بخت احمد وغیرہ موجود تھے۔

(انقلاب۔ دہلی)

VIP ٹرینوں میں اردو اخبارات بھی مہیا کرائے جائیں

ریلوے بورڈ صلاح کار کمیٹی کے رکن مصطفیٰ طارق کا بورڈ کے عہدیداران سے مطالبہ

کانپور (۲۷ اکتوبر)۔ ملک میں چلنے والی راجدھانی سمیت تمام وی آئی پی ٹرینوں میں ہندی، انگریزی کے ساتھ اردو زبان کے اخبارات بھی مسافروں کو مہیا کرائے جائیں۔ اس کا مطالبہ ریلوے بورڈ صلاح کار کمیٹی کے رکن مصطفیٰ طارق نے بورڈ کے عہدیداران سے ملاقات میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ ملک میں گنگا جمنی تہذیب کے فروغ اور انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے میں اردو زبان کا کردار نمایاں رہا ہے، مگر آزاد ملک میں انگریزی زبان کی مقبولیت اور اردو کے ساتھ سوتیلا سلوک انتہائی تشویش ناک ہے۔ دہلی سفر کے دوران راجدھانی ایکسپریس میں ہندی کے ساتھ غیر ملکی انگریزی زبان کے اخبارات کی موجودگی مگر اردو اخبارات کی عدم دستیابی سے مایوس ہوکر انھوں نے ریلوے بورڈ کے افسران سے ملاقات کی اور اردو زبان کے ساتھ سوتیلے سلوک کو غیر مناسب قرار دیتے ہوئے مطالبہ کیا کہ ہندی، انگریزی کے ساتھ اردو اخبارات بھی مسافروں کے لیے مہیا کرائے جائیں۔ اس پر افسران نے یقین دہانی کرائی کہ اگلی میٹنگ میں اس مسئلے کو کمیٹی کے سامنے رکھ کر اردو اخبارات کو بھی دیگر زبان کے اخبارات کے ساتھ مسافروں کے لیے مہیا کرایا جائے گا۔

(انقلاب۔ دہلی)

حکومت مغربی بنگال دو لسانی کی بجائے سہ لسانی فارمولہ نافذ کرے

کلکتہ (۲۳ اکتوبر)۔ ملک آزاد ہونے کے بعد سہ لسانی فارمولہ نافذ کیا گیا، یعنی مادری زبان، علاقائی زبان اور انگریزی۔ لیکن اس سہ لسانی فارمولے کو نظر انداز کرنے میں اتر پردیش کی ریاست سر فہرست ہے۔ مقصد اردو زبان کو نقصان پہنچانا تھا۔ اتر پردیش کے فرقہ پرست عناصر اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ اس کا اثر آج تک نظر آتا ہے۔ پورے ہندوستان میں مغربی بنگال ایک ایسی ریاست ہے جہاں دو لسانی فارمولہ آج تک نافذ العمل ہے۔ مادری زبان اور انگریزی۔ آنجہانی وزیر اعلیٰ مغربی بنگال جناب سدھارتھ شنکر رائے کھلے دل و دماغ کے انسان تھے۔ انھوں نے اس پر غور کیا اور مسلم رہنماؤں کو مشورہ دیا کہ مدھیامک امتحان میں فارسی کی جگہ بنگلہ مضمون اختیار کرنے سے ریاست میں نہ صرف سرکاری نوکری بلکہ ان کو ہر طرح کی سہولتیں حاصل ہوں گی۔ وزیر اعلیٰ کا مشورہ دل کو چھوتا تھا، اس لیے اردو میڈیم پرائمری اسکولوں میں بنگلہ ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائی بھی شروع کردی گئی تھی۔ اتفاق کہیے کہ سدھارتھ شنکر رائے کی حکومت ختم ہوگئی۔ بایاں محاذ برسر اقتدار آیا۔ اس وقت چند نا عاقبت اندیش مسلم دانش وروں کی مخالفت کی وجہ سے بنگلہ پڑھانے کا سلسلہ ختم کردیا گیا۔ چوں کہ اردو طلبہ و طالبات کے لیے یہ مسئلہ بہت اہم ہے، اس لیے انجمن کا ممتا بنرجی اور ان کے اقلیتی امور کے وزیر غیاث الدین ملا سے اپیل ہے کہ وہ اردو میڈیم اسکولوں میں سہ لسانی فارمولہ نافذ کریں۔

(اخبار مشرق۔ کلکتہ)

راشن کارڈ فارم اردو میں دستیاب کرائے کا مطالبہ

رام پور۔ راشن کارڈ بنانے کے لیے نئے فارم مہیا کرائے جا رہے ہیں، اس لیے ان فارموں کو اردو میں بھی دستیاب کرایا جائے۔ مذکورہ فارموں کے ساتھ آمدنی سرٹیفکٹ اور بینک کھاتہ نمبر وغیرہ کی خانہ پُری کی مکمل کرنے کی ہدایت دی گئی ہے، جس کی وجہ سے عام اور غریب آدمی کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ مذکورہ مطالبات سماجی کارکن حکیم نزاکت علی نے ضلع مجسٹریٹ کو ارسال کردہ عرضداشت میں کیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا ہے کہ کیوں کہ زیادہ تر لوگ ناخواندہ ہیں اور فارم بھر نہیں سکتے اس لیے ضروری ہے کہ انتظامیہ کی جانب سے کیمپ لگا کر راشن کارڈوں کو بھروایا جائے۔

(آگ۔ لکھنؤ)

اتر پردیش میں اردو اساتذہ کی تقرری کی کارروائی شروع

میرٹ لسٹ جاری

لکھنؤ (۲۴ اکتوبر)۔ سرکاری پرائمری اسکولوں میں اردو اساتذہ کے 4280 عہدوں پر تقرری کے لیے کٹ آف لسٹ ویب سائٹ www.upbasicedu prisbad gov.in پر جاری کردی گئی ہے۔ امیدوار اپنا ٹی ای ٹی کا رول نمبر اور یوم پیدائش ڈال کر میرٹ لسٹ دیکھ سکتے ہیں۔ جتنے اضلاع سے امیدواروں نے درخواست کی ہے ان سب اضلاع میں ان کی رینک ایک ساتھ پوری ضلع وار دستیاب ہے۔ ضلع میں کاؤنسلنگ کی تاریخ کے لیے ان اضلاع کے ضلع تعلیمی و تربیتی ادارہ (ڈائٹ) سے رابطہ کرنا ہوگا۔ اس کے لیے متعینہ عہدوں سے دوگنا امیدواروں کو کاؤنسلنگ میں بلایا گیا ہے۔ کاؤنسلنگ کی کارروائی ۲۵ اکتوبر سے شروع ہوگی۔

کاؤنسلنگ اور اسناد کی تصدیق کے بعد امیدوار کی آخری فہرست ۷ نومبر کو جاری کی جائے گی۔ سبھی اضلاع کو کاؤنسلنگ کے بعد بچے ہوئے خالی عہدوں کی تعداد ۱۰ نومبر تک بورڈ کو بھیج دینی ہے۔ سماج وادی پارٹی کی حکومت آنے کے بعد سے ہی اردو اساتذہ کی تقرری کی کوشش جاری تھی، لیکن ٹی ای ٹی سے اپنے آپ کو آزاد رکھنے کی ان کی کوشش کے سبب حکومت تذبذب میں تھی۔

آخرکار لنگویج ٹیچروں (زبان کے اساتذہ) کی ٹی ای ٹی کی الگ سے کارروائی کی گئی۔ درخواست اگست، ستمبر میں طلب کی گئی۔ حالاں کہ ان عہدوں کی تعداد سات ہزار کرنے کی اسکیم تھی کیوں کہ اس مرتبہ ہوئے اردو زبان ٹیچر کے ٹی ای ٹی امتحان میں 17624 امیدوار کامیاب ہوئے ہیں اور حکومت ان میں سے زیادہ کو فائدہ پہنچانا چاہتی تھی۔ لیکن کچھ تکنیکی وجوہات کی بنا پر ایسا ممکن نہیں ہوسکا اور تقرری 4280 عہدوں پر ہی شروع ہوئی ہے۔ یہ خبر یقیناً اردو داں طبقے کے لیے خوشی کی بات ہے کیوں کہ گزشتہ کئی برسوں سے ریاست میں اردو اساتذہ اپنے حقوق کے لیے احتجاج اور مظاہرہ کرتے رہے ہیں۔

(انقلاب۔ دہلی)

اردو کے اساتذہ کی ذمے داریاں دیگر شعبوں کے اساتذہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں

شعبۂ اردو، گورنمنٹ ایم ایل بی گرلز کالج بھوپال میں ایک روزہ ورک شاپ

بھوپال۔ مقامی ایم ایل بی گرلز کالج بھوپال میں ۱۸ اکتوبر ۲۰۱۳ کو ایک روزہ ورک شاپ منعقد کیا گیا۔ یہ ورک شاپ صوبے کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے شعبۂ اردو کی کارکردگی سے متعلق تھا۔ موضوع تھا 'مدھیہ پردیش کی یونیورسٹیوں/کالجوں میں اردو تعلیم (ماضی، حال اور مستقبل)'۔ ورک شاپ میں ایم ایل بی گرلز کالج کے شعبۂ اردو کے اساتذہ کے علاوہ جبل پور کے ڈاکٹر اشفاق عارف اور جناب سید اختر موجود تھے۔ پروفیسر آفاق احمد کی صدارت میں منعقدہ اس ورک شاپ کو کالج کی پرنسپل ڈاکٹر منجولا شرما نے بھی خطاب کیا اور اپنے کالج کے شعبۂ اردو کی کارکردگی پر خوشی کا اظہار کیا۔ پرنسپل ممتاز عظیم نے برملا کہا کہ دیگر شعبوں کے اساتذہ کے مقابلے میں اردو کے اساتذہ کی ذمے داریاں کہیں زیادہ ہیں۔ انھیں اردو کے خدمت گار کی حیثیت سے کام کرنا ہے اور اپنے وقار کے ساتھ ملازمت کی ذمے داریوں کو بھی ایمان داری کے ساتھ پورا کرنا ہے۔ ڈاکٹر بلقیس جہاں، جو اس سیمینار اور ورک شاپ کی محرک رہیں، انھوں نے حاضرین اور مندوبین کا استقبال کیا اور ورک شاپ کی غرض و غایت سے آگاہ کیا۔ سیفیہ کالج کے سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر حیدر عباس رضوی نے سیفیہ کالج میں اردو کے تحقیقی و تنقیدی مقالات پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر قدسیہ اختر نے سیفیہ کالج کے شعبۂ اردو سے متعلق مضمون پڑھا اور اس میں انھوں نے اردو کے طلبہ و طالبات کی صورت حال پر بھی اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر عتیق النساء نے اردو کے اساتذہ کی دشواریوں اور طلبہ کی کمی کی طرف توجہ کیا۔ ایم ایل بی کالج کی پروفیسر انیس سلطانہ نے بھوپال کی درس گاہوں اور دانش گاہوں میں تحقیق اور تنقید کی رفتار پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر شمینہ پروین، نسیمہ ملک اور ڈاکٹر صبا عارف وغیرہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر فرزانہ رضوی (سیہور) کا مقالہ ڈاکٹر بلقیس نے پڑھ کر سنایا۔ ڈاکٹر بلقیس جہاں نے بھی بھوپال کے کالجوں میں اردو کی تعلیم پر اظہار خیال کیا۔ آخر میں ڈاکٹر جیبہ نے بھی حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

(آنچل۔ بھوپال)

فرسٹ ٹرم ختم ہونے کے بعد بھی دہلی کے اسکولوں میں
اردو اساتذہ کی تقرری نہیں ہو پائی

نئی دہلی (۲۲ اکتوبر)۔ رواں تعلیمی سال کا ایک ٹرم ختم ہونے کے بعد بھی اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری نہیں ہو پائی ہے، جس کی وجہ سے طلبا اس سال اردو پڑھنے سے محروم ہیں۔ اب چوں کہ الیکشن کا اعلان ہو چکا ہے، ایسے میں اردو اساتذہ کی تقرری میں ایک بڑی رکاوٹ پیدا ہوگئی ہے، لیکن محکمہ تعلیم چاہے تو اس کا متبادل تلاش کر سکتا ہے۔ اردو کے 65 مستقل اساتذہ کی تقرری کے لیے لیے گئے امتحان کا رزلٹ ڈیڑھ سال بعد بھی نہیں آیا ہے۔ یہ حال ہے دہلی کی دوسری سرکاری زبان اردو کا۔ کاغذوں پر تو یہ زبان دوسری سرکاری زبان ہے مگر حکومت کی عدم توجہی کی وجہ سے یہ زبان فروغ نہیں پا سکی۔ کسی بھی سرکاری دفتر میں اردو کی تختی بھی نظر نہیں آتی۔ اس سال حکومت نے اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے بڑے پیمانے پر شروعات کی، مگر کہیں سی ٹیٹ، کہیں افسر شاہی اور کہیں اسکول انتظامیہ اس میں حائل نظر آیا۔ حکومت نے اردو اساتذہ کی تقرری میں آرہی رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش تو کی مگر انتخابات کا اعلان ہوتے ہی حکومت بیک فٹ پر آگئی۔ اب سب سے بڑا مسئلہ اردو پڑھنے والے طلبہ کا ہے جو یا تو سنسکرت پڑھنے پر مجبور ہیں یا پھر اردو ٹیچر کا انتظار کر رہے ہیں۔ گزشتہ ماہ ختم ہوئے فرسٹ ٹرم کے امتحانات میں بھی اردو کے طلبہ اساتذہ سے محروم رہے۔ امید تھی کہ امتحان کے بعد اردو اساتذہ کی تقرری کا عمل شروع ہو جائے گا۔ اس دوران وزیر تعلیم کی جانب سے کئی وعدے اور اعلانات کیے گئے مگر ان میں سے بیشتر وفا نہیں ہو پائے جس کا خمیازہ طلبہ کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ گزشتہ سال 55 میں سے 52 اسکولوں میں اردو سیکشن کھولا گیا تھا، مگر اس سال ان اسکولوں میں اردو کی پڑھائی شروع تک نہیں ہوئی۔ محکمہ تعلیم نے بھی اس جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ اگر اردو اساتذہ کی تقرری میں سی ٹیٹ یا دوسری شرائط حائل تھیں تو وقتی طور پر اردو اساتذہ کا انتظام کیا جانا چاہیے تھا، مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ اسکولوں پر نظر رکھنے والے لوگوں کا کہنا ہے کہ چار ماہ بعد بھی کوئی ٹیچر مقرر نہیں کیا گیا۔ بس وعدے پر وعدے کیے جا رہے ہیں۔ دوسری جانب دہلی سبورڈینیٹ سروس سلیکشن بورڈ (ڈی ایس ایس بی) کے 65 پرماننٹ اردو اساتذہ کا رزلٹ ڈیڑھ سال بعد بھی نہیں آیا ہے، جس کی وجہ سے اسکولوں میں پڑھائی متاثر ہو رہی ہے۔ اطلاع کے مطابق باقی دیگر مضامین کے اساتذہ کی تقرری ہو چکی ہے۔ دہلی میں اردو اساتذہ کی کل 262 سینکشن پوسٹ ہیں لیکن ان میں سے صرف 69 اساتذہ ہی مستقل ہیں۔ ان 262 اساتذہ کی تقرری 133 اسکولوں میں ہونی تھی۔ ان میں سے 115 اردو کا ولی کے ہیں، 69 فی الحال مستقل ہیں اور 63 مستقل اساتذہ کا ابھی تک رزلٹ ہی نہیں آیا ہے۔ جنوری ۲۰۱۰ میں ان 65 اردو کی مستقل پوسٹ کے لیے فارم پُر کروائے گئے تھے۔ مئی ۲۰۱۲ میں اس کے امتحانات ہوئے تھے اور اب ڈیڑھ سال گزرنے کے بعد بھی نتائج کا اعلان نہیں کیا گیا جب کہ ان کے ساتھ ہوئے دیگر زبانوں کے نتائج بھی آگئے اور اساتذہ کا تقرر بھی ہو گیا۔
(انقلاب۔ دہلی)

اردو اساتذہ کی تقرری کا عمل شروع

گریٹر نوئیڈا (۲۸ اکتوبر)۔ جونیئر اسکولوں میں اردو پڑھنے کی خواہش رکھنے والے طلبہ کی امید جلد پوری ہوگی۔ حکومت کی ہدایت پر ضلع میں 33 اساتذہ کی تقرری کا عمل شروع ہو گیا ہے۔ یہ عمل نومبر کے آخر تک مکمل ہونے کی امید ہے۔ کاؤنسلنگ پوری ہونے کے بعد اساتذہ کو اسکول منتقل ہوں گے۔

ضلع کے اسکولوں میں اردو اساتذہ کی کمی تھی۔ تقریباً ایک درجن اسکولوں میں ہی اردو اساتذہ تھے۔ دیگر اسکولوں میں اردو اساتذہ کے عہدے خالی تھے۔ اس وجہ سے اردو سیکھنے کی خواہش رکھنے والے طلبہ کو پریشانی ہو رہی تھی۔ طلبہ کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے حکومت نے تقریباً ایک ماہ قبل اردو اساتذہ کی تقرری کا حکم دیا تھا۔ ضلع میں عمل شروع ہو گیا ہے۔ تقرری میرٹ لسٹ کی بنیاد پر ہونی ہے۔ تقرری کے لیے کافی لوگوں نے درخواست دی ہے، لیکن ان کی میرٹ لسٹ کم ہے۔ ایک کاؤنسلنگ پوری ہونے کے بعد میرٹ نیچے آئے گی۔ یہ عمل مکمل ہونے کے بعد محکمہ اسکولوں میں سروے کرائے گا کہ کس اسکول میں کتنے طلبہ اردو پڑھنے کے خواہش مند ہیں۔ جس اسکول میں طلبہ کی تعداد زیادہ ہوگی اردو اساتذہ کی تعیناتی انہی اسکولوں میں ہوگی۔
(انقلاب۔ دہلی)

مترجم و اردو میڈیم سرکاری مدارس میں
اکیڈمک انسٹرکٹرز کے تقرر کے لیے ضلع کلکٹر سے نمائندگی

آرمور (۲۳ اکتوبر)۔ تلنگانہ اردو جرنلسٹ فورم آرمور ڈویژن کی جانب سے ڈی پی آر او نظام آباد دفتر پر مترجم اور اردو میڈیم سرکاری مدارس میں اکیڈمک انسٹرکٹرز (معلم) کے تقرر کے لیے ضلع کلکٹر پردیومنا سے نمائندگی کی گئی۔ تفصیلات کے بموجب آج تلنگانہ اردو جرنلسٹ فورم آرمور کے نمائندوں نے فورم کے نائب صدر سید ظفر علی کی نگرانی میں ضلع کلکٹر نظام آباد پردیومنا کو ایک یادداشت پیش کی جس میں بتایا گیا کہ ضلع نظام آباد میں آرمور، بودھن، کاماریڈی، بھیمگل وغیرہ ایسے ڈویژن ہیں جہاں پر اردو والوں کی کثیر تعداد پائی جاتی ہے اور یہاں سینکڑوں کی تعداد میں اردو زبان جاننے والے اور اردو اخبارات کا مطالعہ کرنے والے افراد ہیں اس لیے ان کے مسائل جو اخبارات میں شائع کیے جاتے ہیں انھیں عہدیداروں کے علم میں لانے کے لیے ڈی پی آر او دفتر پر ایک مترجم کی شدید ضرورت ہے۔ ضلع کلکٹر سے فورم کے نمائندوں نے مطالبہ کیا کہ جلد سے جلد ڈی پی آر او دفتر پر مترجم کا تقرر کریں۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ ضلع کے مختلف سرکاری مدارس میں جہاں پر معلم نہیں ہیں اکیڈمک انسٹرکٹرز کا تقرر کیا گیا لیکن ضلع میں ایسے کئی اردو اپر پرائمری ہائی اسکول ہیں، جہاں پر مستقل معلم نہیں ہے۔ فورم نے مطالبہ کیا کہ اردو سرکاری مدارس اپر پرائمری ہائی اسکولوں میں مستقل معلم کا تقرر کیا جائے۔ اس موقع پر ضلع کلکٹر نے فورم کے نمائندوں کو تقرر کرنے کا یقین دلایا۔
(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

پی ایچ ڈی کرنے والے اردو طلبہ کو پریشانیوں کا سامنا
بی این منڈل یونیورسٹی انتظامیہ سے اس سمت میں کارروائی کا مطالبہ

مدھے پورہ، بہار (۱۳ اکتوبر)۔ بی این منڈل یونیورسٹی میں اردو فیکلٹی کے ساتھ مسلسل ناانصافی کی جا رہی ہے، کیوں کہ اس یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ نہیں ہونے کی وجہ سے پی ایچ ڈی کرنے والے اردو طلبہ و طالبات کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ یونیورسٹی انتظامیہ کی طرف سے ان طلبہ و طالبات کے داخلے کے لیے مناسب نظم نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے کئی طلبہ داخلہ لینے سے قاصر رہ گئے۔ کئی طلبہ نے نامہ نگاروں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ ہم لوگ پٹنہ، پورنیہ اور دیگر علاقوں سے یہاں آئے ہیں کیوں کہ بی این منڈل یونیورسٹی سے ہم لوگوں نے پری پی ایچ ڈی کا امتحان دیا تھا اور اس میں کامیابی بھی حاصل کی تھی۔ تقریباً چھ ماہ کے بعد پتا چلا کہ داخلے کی کارروائی شروع ہو چکی ہے اور جب ہم لوگ یونیورسٹی پہنچے تو وہاں شعبۂ اردو کے کسی عہدیدار سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ایک دو روز رہنے کے بعد جب کوئی فائدہ نہیں ہوا تو مجبوراً ہم لوگ واپس گھر آگئے لیکن جب بعد میں پتا چلا کہ داخلے کی کارروائی تقریباً ختم ہو گئی ہے تو ہم لوگوں نے ایک بار پھر وائس چانسلر سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن وائس چانسلر کا کہنا ہے کہ میں اس معاملے میں اب کچھ نہیں کر سکتا کیوں کہ اردو طلبہ و طالبات کے داخلے کے لیے شعبۂ اردو کے صدر کو ذمہ داری سونپ دی گئی تھی، خاص طور پر مسلم طالبات کو زیادہ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس سلسلے میں طلبہ نے یونیورسٹی انتظامیہ سے فوری کارروائی کا مطالبہ کیا ہے۔
(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

عربی-فارسی کو یو پی ایس سی سے باہر کیے جانے کے خلاف احتجاج

لکھنؤ (۳۱ اکتوبر)۔ عربی-فارسی کو یو پی ایس سی سے باہر کیے جانے کی مخالفت میں آل انڈیا اسٹوڈنٹ ایسوسی ایشن (آئسا) نے منگل کو لکھنؤ یونیورسٹی کے گیٹ پر دھرنا دیا اور یو پی ایس سی کے چیئرمین کا پتلا نذرِ آتش کیا۔ ساتھ ہی عربی-فارسی کو دوبارہ یو پی ایس سی میں شامل کیے جانے کا مطالبہ کیا۔ آئسا کے کیمپس صدر رویندر سنگھ نے کہا کہ عربی-فارسی زبانوں کو یو پی ایس سی سے باہر کیے جانے سے مستقبل میں ہمارے ملک کی حفاظت کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے کیوں کہ عربی-فارسی زبان میں آنے والے خطوط اور خفیہ محکمے کے ذریعے عربی-فارسی زبان میں حاصل دستاویزات کو پڑھنے میں دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔
(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اردو پرائمری اسکول موڑتانڈ میں
اکیڈمک انسٹرکٹر کا تقرر

موڑتانڈ، آندھرا پردیش (۱۵ اکتوبر)۔ روزنامہ 'اعتماد' میں شائع خبر کے بعد اردو میڈیم پرائمری اسکول موڑتانڈ میں ایک عدد اکیڈمک انسٹرکٹر کا تقرر عمل میں آیا۔ اس اسکول میں اساتذہ کی کمی کے خلاف دو روز قبل طلبہ کے سرپرستوں نے دفتر منڈل ایجوکیشن کے روبرو دھرنا منظم کیا تھا۔ اسکول میں 120 طلبہ زیر تعلیم ہیں جن کے لیے صرف دو ٹیچرس خدمات انجام دے رہے تھے جب کہ پانچ اسامیاں خالی ہیں۔ اسکول میں مزید دو اساتذہ کی سخت ضرورت ہے۔
(اعتماد۔ حیدرآباد)

اک دیا اور بجھا

اردو کے مشہور شاعر اور ادیب جناب سکندر عرفان کا ۲۸ اگست ۲۰۱۳ کو انتقال ہو گیا۔ وہ کافی عرصے سے بیمار تھے اور گردوں کے عارضے میں مبتلا تھے، لیکن وہ اتنے حوصلہ مند انسان تھے کہ ان کی کسی تحریر یا ان کے کسی عمل سے یہ ظاہر نہیں ہوا کہ مایوسی کے سائے ان پر سے گزرے ہیں۔ شاعری کے مجموعوں کے علاوہ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ بچوں کے لیے تحریر کی گئی ان کی کہانیاں اور نظمیں بچوں کے ادب میں یقیناً اضافہ کہلائیں گی۔

ماہنامہ 'قرطاس' ناگپور نے چند ماہ پہلے ہی سکندر عرفان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں ایک خاص نمبر شائع کیا تھا۔ ان کی تخلیقات 'کاروانِ ادب' اور 'صدائے اردو' رسائل میں اکثر شائع ہوتی رہتی ہیں۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

○

اردو کے مشہور صحافی جناب محمد شریف کا ۲۸ اکتوبر ۲۰۱۳ کو حیدرآباد میں انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر صرف 48 برس تھی۔ وہ گزشتہ تقریباً ایک ماہ سے علیل تھے اور دواخانے میں زیر علاج تھے۔ مرحوم کے پس ماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو لڑکے اور ایک لڑکی شامل ہیں۔ محمد شریف ایک معروف صحافی تھے اور روزنامہ 'اعتماد' سے وابستہ تھے۔ وہ حیدرآباد یونین آف جرنلسٹس کے خازن بھی تھے۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نئی کتابیں

نام کتاب : راس مسعود
مصنف : حکیم سید ظل الرحمن
ضخامت : ۲۹۳ صفحات
قیمت : ۲۵۰ روپے
ناشر : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، ۲۱۲-راؤز ایونیو
نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
تبصرہ نگار : ڈاکٹر رضیہ حامد

حکیم ظل الرحمن کو طب سے دلی شغف اور تعلق ہے۔ ان کی بیشتر کتب طب سے متعلق ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کو ادب اور تاریخ سے بھی لگاؤ ہے۔ وہ ایک نستعلیق شخص ہیں۔ ہندو بیرون ہند علمی، ادبی و طبی سیمیناروں میں شرکت کرتے رہتے ہیں۔ ان کی علمی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے اپنے گھر کے ایک بڑے حصے میں 'ابن سینا اکاڈمی' کے نام سے ایک علمی ادارہ قائم کیا ہے، اس میں مختلف مضامین سے متعلق نادر و نایاب کتب موجود ہیں۔ اردو شعر و ادب سے متعلق بھی کتب ان کی اکیڈمی میں ہیں۔ خاص طور سے غالبیات کے موضوع پر ان کا ذخیرہ کتب و رسائل بڑی تعداد میں ہے۔

حکیم ظل الرحمن کی تصانیف و تالیفات کی تعداد تین درجن سے تجاوز کر چکی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب سر سید کے پوتے راس مسعود پر منظر عام پر آئی۔ اس سے پہلے راس مسعود پر کوئی جامع کتاب معرض وجود میں نہیں آئی تھی۔ پروفیسر ظل الرحمن نے بڑی کد و کاوش، تحقیق و جستجو کے بعد یہ کتاب قلم بند کی ہے۔ پروفیسر ظل الرحمن نئی نسل کو اپنے بزرگوں، پیش روؤں سے واقف کرانا فرض عین جانتے اور مانتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

''سر سید، جسٹس محمود اور راس مسعود نے مسلمانان ہند کی نشاۃ ثانیہ میں جو کلیدی کردار ادا کیا ہے اس کا ہماری نسلوں کو علم نہیں اور وہ بڑی حد تک اس سے بے خبر ہیں۔ اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ سر سید اور ان کے خاندان کے افراد کی تعلیمی، ثقافتی اور سماجی میدان میں جو خدمات ہیں انھیں صحیح پس منظر میں سامنے لایا جائے''۔

حکیم ظل الرحمن نے راس مسعود کی سوانح کو ۱۳۳ عنوانات کے تحت تحریر کیا ہے جو راس مسعود کی پوری زندگی کا احاطہ کرتے ہیں، جیسے پیدائش، بسم اللہ، ابتدائی تعلیم، لندن میں تعلیم، حیدرآباد میں تقرر، انجمن ترقی اردو (ہند) کی صدارت، علی گڑھ کی وائس چانسلری، بھوپال کی وزارت تعلیم، وفات، تصنیفات، زندہ دلی، مجلس آرائی وغیرہ۔ یہ عنوانات بغیر تسلسل کے درج کیے گئے ہیں۔

حکیم ظل الرحمن نے اس کتاب میں جزئیات کو بھی ملحوظ رکھا اور ان کے بیان میں کوئی کمی نہیں آنے دی ہے۔ عبارت میں سادگی، شگفتگی اور روانی ہے۔ قاری کے لیے ایک مرتبہ کتاب ہاتھ میں لینے کے بعد ختم کیے بغیر ہاتھ سے رکھنا سخت دشوار عمل ہے۔ اکثر جگہ آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ اس کتاب میں سر راس مسعود، نواب حمید اللہ خاں اور علامہ اقبال کے تعلقات کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جو اردو ادب کی تاریخ اور بھوپال کی تاریخ کا جزو لازم ہے۔

حکیم ظل الرحمن نے بڑی جاں فشانی، دیدہ ریزی اور خلوص نیتی سے یہ کتاب تصنیف کی ہے۔ اتنی بسوط کتاب لکھنے پر مصنف کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے ''اللہ کرے زور قلم اور زیادہ''۔

ooo

نام کتاب : باتیں مشاعروں کی
(مشاعروں سے متعلق سے چند دل چسپ تجربات)
مصنف : ڈاکٹر محبوب راہی
ضخامت : ۱۹۲ صفحات
قیمت : ۲۰۰ روپے
ملنے کا پتا : ایم ایم ایجنسی، باری نالی
اکولہ، مہاراشٹر-444401
تبصرہ نگار : قاضی رؤف انجم

محبوب راہی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن انھوں نے فن شاعری کی تقریباً تمام تر مروجہ اصناف پر خامہ فرسائی کے علاوہ نثر نگاری میں بھی اپنے قلم کے نہ صرف جوہر دکھائے ہیں بلکہ نثر نگاری میں ایک طرز خاص اختیار کر کے اپنے آپ کو مشاہیر قلم کاروں کے ہم پلہ ثابت کر کے ان کے شانہ بہ شانہ کھڑا ہونے کی کوشش کی ہے یہی وجہ ہے کہ نظم و نثر کی کم و بیش تمام تر موضوعات پر ان کی چونتیس کتابیں منظر عام پر آکر قارئین سے سند مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب کا نمبر 35واں ہے، جس میں محبوب راہی نے صف اول کے شعرا ملک زادہ منظور احمد، منور رانا، راحت اندوری، ساغر اعظمی، اختر آصف، جلیل برہانپوری، سفیان قاضی کے علاوہ دور جدید سے اقبال خلش، عظیم وقار، تسیم فراز اور شمیم فرحت کے فن تغزل اور پیش کش پر بہ طور خاص خامہ فرسائی کی ہے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی اس کتاب کا انتساب بھی انھی شعرا کے نام کیا ہے جنھوں نے مشاعروں میں کامیابی اور مقبولیت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی شاعری میں شعری معیارات کا بھی بھرپور التزام روا رکھا ہے جس کے لیے محبوب راہی خود معترف ہیں کہ نامورانِ مشاعرہ کے علاوہ اس میدان کے چند تازہ واردان بساط نو پر میرے مضامین میرے بنیادی تحقیقی رویے کے غماز ہیں جو مجھے اپنے ذروں میں چاند ستاروں کی تابانی کے امکانی جلوے دکھلاتے رہتے ہیں۔ کتاب کا مقدمہ پروفیسر مظفر حنفی کے قلم کا مرہون منت ہے جس میں انھوں نے حقیقت نگاری کا ثبوت دیتے ہوئے لکھا ہے کہ آج مشاعرہ اپنے زوال کی آخری حدوں کو چھو رہا ہے، ایسے میں محبوب راہی کی یہ کتاب کسی خاص نتیجے پر پہنچنے میں کس حد تک معاون ہوگی۔ حتمی طور پر کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ جہاں انھوں نے مشاعروں کے بارے میں اپنے مثبتی تجربات کی روشنی میں ان کے زوال پر انگشت نمائی کرتے ہوئے اس کے اسباب و عوامل کی نشان دہی کی ہے وہیں دوسری طرف ہم عصر مشاعرے کے چند مقبول عام شعرا کی شان میں قصیدہ خوانی بھی کی ہے۔ راہی نے ایسے شعرا کے بارے میں بھی قلم اٹھا کر اپنی اصابت رائے کا ثبوت دیا ہے جو ادب کے ساتھ شعری لطافتوں کی بھی رہنمائی کرتے ہیں۔

اپنے مضامین کے ذریعے صاحب کتاب نے مشاعروں میں پیش آنے والے چند دل چسپ حقائق و تجربات سے قارئین کو روشناس کرانے کے لیے تفصیلات کی کچھ اس انداز میں منظر کشی کی ہے کہ قاری اپنے آپ کو مشاعرہ گاہ کے پنڈال ہی میں محسوس کرتا ہے۔ دنیائے شعر و ادب کی نامور شخصیتوں و عہد ساز ہستیوں کا تذکرہ ان کی مطبوعات کے حوالے سے اکتساب لطف کی قارئین کو ترغیب دی گئی ہے۔ کتاب کی ابتدا ہی میں 'آئینہ کا سچ' کے عنوان سے محبوب راہی کے دو شعر اپنے اندر قارئین اور بالخصوص ناقدین کے لیے معنویت کا ایک بحر ذخار رکھتے ہیں:

آئینہ سچ ہی دکھاتا ہے ہمیشہ ہو بہو
صرف اظہار صداقت ہی رہی ہے اس کی خو
کرنہیں سکتے جو تم چہرے کے داغوں کا علاج
دوستو! جاتے ہو کیوں پھر آئینے کے روبرو

اوراق پبلی کیشنز نئی دہلی کے زیر اہتمام کتاب کی کمپوزنگ اور طباعت دونوں عمدہ ہیں۔

ooo

بقیہ: مولانا آزاد کے ایک اہم عصر...

صفحہ ۸ سے آگے

مولانا محمد علی کو نشانہ بنایا تھا، جس کے جواب میں 'اڈیٹر کامریڈ' کی دو چٹھیاں 8 اور 15 ستمبر 1912 کے 'الہلال' کے پرچوں میں نکلی تھیں۔ 1913 میں مولانا آزاد نے اپنے بے مثال طنزیہ اسلوب میں 'نذر نیم شبی کا سچ ماز' کے عنوان سے 'الہلال' میں تین قسطوں میں دہبر کے قصیے کو جزئیات کے ساتھ سپرد قلم کیا تھا۔ جا بجا طنزیہ اشعار سے مسجع اس مضمون کے دو شعر یوں تھے:

معشوق ما بہ شیوہ ہر کس موافق است
با ما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

رات کی رات میں 'دل بدلی' کرنے والوں پر یہ شعر منطبق کیا گیا تھا:

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے!

مولانا آزاد کی اس مہم میں علامہ شبلی ان کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ لکھنؤ کے مذکورہ اجلاس پر انھی ان کی ایک نظم کا شعر ہے:

اب کے جو لکھنؤ میں دکھایا گیا سماں
سچ پوچھیے تو مضحکۂ روزگار ہے

انھوں نے 'مقدسین علی گڑھ' کو نشانہ بناتے ہوئے سرکار سے یونی ورسٹی کے الحاق پر کفاف، وضاف اور نقاد کے ناموں سے 'الہلال' (13-1912) کے پرچوں میں کئی طنزیہ نظمیں لکھی تھیں۔

مولانا ماجد کی سیاست، مولانا محمد علی کی حاشیہ نشینی تک محدود تھی اور مولانا محمد علی پر زیادہ گفتگو کا یہاں موقع نہیں۔ مولانا آزاد کے لیے مولانا ماجد نے لکھا تھا کہ ان کے دل کی جگہ بھی دماغ نے لے لی تھی، جب کہ مولانا محمد علی کے سوانح نگاروں کے بموجب وہ انتہائی درجے کے جذباتی انسان تھے اور جذباتیت میں ایسے موقعے بھی آتے تھے جب وہ پاسبان عقل کا ساتھ چھوڑ دیا کرتے تھے۔ جب 1924 میں مصطفیٰ کمال پاشا نے خلافت کے خاتمے کا اعلان کیا تھا تو اس صدمۂ عظیم نے مولانا محمد علی کی وطنیت کا جذبہ بھی سرد کر دیا تھا۔

ہاں، تو بات 'الہلال' کی ہو رہی تھی، جس کی جدید عربی اخبارات کے معیار کی طباعت اور تصاویر کی زیبائش اور اڈیٹر 'الہلال' کے رعد و ابر کے سے خارا شگاف طرز نگارش سے اس دور کے اہل نظر ہی مسحور نہیں ہوئے تھے بلکہ آج کے نقاد و دانش ور بھی جو ہیں سالک احمد آنکتی یا بی الکلام الدہلوی کی ہمت و حوصلے کو دیکھ کر متحیر رہ جاتے ہیں، لیکن مولانا ماجد کو وہ پسند نہیں آیا تھا اور اس بات کا اعتراف بھی بڑی ایمان داری سے انھوں نے اپنی 'آپ بیتی' میں کر دیا تھا کہ 'وہ مولانا آزاد کے مخالفین ہی کے گروہ میں شامل رہے'۔ مزید یہ کہ:

''ایک اُدھ ترجمہ کسی ادبی رسالے سے 'الندوہ' کے لیے بھیجا تھا اور وہ وہاں سے 'الہلال' میں پہنچ گیا اور میری مرضی کے خلاف اس میں چھپ بھی گیا... مولانا آزاد سے ذاتی تعلقات اس وقت بھی خاصے تھے، لیکن ان کے پرچے 'الہلال' کی علمی حیثیت کی کوئی وقعت دل میں نہ تھی۔'' (ص: 214)

مذکورہ بالا اقتباس سے اُن کی غلط بیانی ظاہر ہوتی ہے، اس لیے کہ مولانا آزاد نے اس ترجمے کی رسید دیتے ہوئے انھیں 26 مئی 1913 کو اپنے خط میں لکھا تھا: 'صدیقی العزیز، عطیۂ گرامی کا شکریہ۔ حسب الارشاد دو نمبروں میں شائع ہو جائے گا'۔ اور اُن کا یہ انگریزی مضمون 'الہلال' کی دو اشاعتوں (18 اور 25 جون 1913) میں 'فلفہ کرب' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

مذکورہ بالا اقتباس سے اُن کی غلط بیانی ظاہر ہوتی ہے، اس لیے کہ مولانا آزاد

نے اس ترجمے کی رسید دیتے ہوئے انھیں 26 مئی 1913 کو اپنے خط میں لکھا تھا: "صدیق العزیز، ہدیۂ گرامی کا شکریہ۔ حسب الارشاد دو نمبروں میں شائع ہو جائے گا"۔[۶] اور ان کا یہ انگریزی مضمون 'الہلال' کی دو اشاعتوں (18 اور 25 جون 1913) میں 'حظ و کرب' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ مولانا آزاد نے مضمون کے خاتمے پر اپنے 'فٹ نوٹ' میں لکھ دیا تھا کہ انگریزی کے Pain and Pleasure کے لیے اردو میں زیادہ بہتر لفظ 'لذت و الم' کے موجود ہیں اور ان کی جگہ 'حظ و کرب' کا استعمال غیر مناسب ہے۔ اس پر مولانا ماجد نے خفا ہو کر کئی گرما گرم مراسلے انھیں لکھے۔ ادھر مولانا آزاد 'ابجل' تو تھے نہیں کہ طرح دے جاتے، انھوں نے بھی ایک تحمل کے ساتھ ترکی بہ ترکی جواب دیے۔ ایک بار مولانا ماجد کو 'الہلال' کے متوقع شمارے میں اپنا مراسلہ نظر نہ آیا تو انھوں نے جارحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے لکھا کہ "وہ اپنا جواب دوسرے اخبارات میں شائع کر دیں گے۔"

مولانا آزاد نے جواب میں لکھا:

"....یا یہ کہ آپ اس کو دوسرے اخبارات میں شائع فرمائیں گے تو شاید میں نے اب تک کوئی کوشش اس طرح کی نہیں کی ہے کہ لوگ اپنے مضامین 'الہلال' کے سوا دیگر رسائل میں شائع نہ کریں۔"[۷]

اکبر الٰہ آبادی نے مولانا آزاد کو خط لکھا تھا کہ "جناب والا، 'حظ و کرب' اور 'لذت و الم' کے مقدمے میں اگر میری گواہی کچھ وقعت رکھتی ہو تو آپ اپنا گواہ مجھ کو قرار دے سکتے ہیں"۔[۸] اس پر مولانا ماجد اکبر سے بھی خفا ہو بیٹھے تھے۔ جب مولانا ماجد کا رویہ گستاخی کی حدوں میں داخل ہو گیا تو مولانا آزاد نے اس بحث و تکرار کی آخری قسط ('الہلال' 22 اکتوبر 1913) میں لکھا تھا:

"اب تک تو یہی مصیبت تھی کہ آپ 'حظ و کرب' کا مطلب وہ نہیں سمجھتے تھے جو سمجھنا چاہیے، لیکن یہ تو بڑی مصیبت ہوئی کہ اب 'مغالطات منطق'، 'سپاہ دری'، 'بیا کاذ الاکاذیب'، 'کمالات علمیہ'، اور 'بے حد شرم ناک' کے متعلق بھی مجھے خوف پیدا ہو گیا ہے کہ آپ ان کے معانی سے بے خبر ہیں اور نہیں جانتے کہ ان الفاظ کو کن موقعوں پر بولنا چاہیے...."

لطف کی بات یہ کہ اسی سال مولانا ماجد سیاحی کے شوق میں اپنے ایک ملازم کے ساتھ کلکتے جا پہنچے اور مولانا آزاد کے پاس اس غرض سے گئے کہ کسی سستے ہوٹل کا پتا دریافت کریں، لیکن مولانا آزاد نے انھیں اپنا مہمان بنا لیا اور بقول ماجد 'میزبان نے اکرام مہمان کا پورا حق ادا کر دیا، اور وہ چار پانچ دن بعد لکھنؤ لوٹ گئے'۔[۹]

(باقی آئندہ)

○○○

کی تاریخ ان تمام واقعات کی شاہد اور حقائق کی موید ہے۔ راقم کی ان معروضات کی توثیق رشید احمد صدیقی کی ان سطور سے بھی ہوتی ہے:

"بیسویں صدی کے عشرۂ اول میں مسلمانوں کی سیاسی اور قومی زندگی نے جو رنگ اور رُخ اختیار کیا، اس کی قیادت اتنی حرکی، محکم اور ہمہ جہتی نہ تھی کہ جتنا وقت کا تقاضا۔ اس وقت ایک نئے سرسید کی ضرورت تھی۔ میرے نزدیک یہ رول مولانا ابوالکلام آزاد نے ادا کیا۔"

(بحوالہ 'مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم'، علی گڑھ میگزین، ۱۹۵۹ء)

مسلمانوں کے جن اداروں کا ذکر بالائی عبارتوں میں کیا گیا، ان کی سرپرستی و خدمت دراصل اردو کی ہی خدمت تھی کہ انھی اداروں کے دم سے آج اردو زندہ و تابندہ ہے، اگر چہ کئی خواب ابھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے ہیں، تاہم امکانات کسی نہ کسی حد تک روشن ضرور ہیں۔

بہ حیثیت ایک ملکی، معاشرتی و استعمالی زبان کے، اردو کی بقا اور اس کے فروغ کے لیے مولانا آزاد کی خدمات بنیادی نوعیت کی ہیں اور تاریخی اہمیت کی حامل۔ دراصل وہ اس راز سے واقف تھے کہ اگر آزاد ہندستان میں روزگار کے ساتھ اردو کا دیرینہ رشتہ برقرار نہ رہا تو اس کی بقا و زیست کی ضمانت نہ دی جا سکے گی، اس لیے انھوں نے ایسے عملی اقدام کیے کہ اردو کی تدریس رائج الوقت نظام تعلیم کا جزو لازم بن جائے۔ اولین وزیر تعلیم کی حیثیت سے جب انھوں نے ایک جدید نظام تعلیم کا خاکہ مرتب کیا تو اردو کا احترام رکھا۔ انھوں نے سرکاری تعلیمی اداروں میں اردو تعلیم کی گنجائش نکالنے کے لیے سہ لسانی فارمولے کی تجویز پیش کی اور ہندی و انگریزی کے ساتھ تیسری زبان کے طور پر اردو کو اس کا حصہ بنایا۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ کم از کم شمالی ہند، جہاں ہندی کے علاوہ کوئی علاقائی زبان نہ تھی، اور بالخصوص اترپردیش اور بہار میں، جو بھی اردو کے علاقے تھے، اردو کی تعلیم صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ سب کے لیے لازم و ملزوم بن جائے۔ دراصل یہ ایک طویل مدتی منصوبہ تھا اور مولانا کی فراست و معاملہ فہمی کا ایک اعلیٰ و ارفع نمونہ، جس کے عملی و افادی نتائج چند برسوں بعد سامنے آتے اور وقت کے ساتھ مستقل ہو جاتے، مگر افسوس کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی، اور ان کے جانشینوں نے اس طرف چنداں توجہ نہ کی۔ سہ لسانی فارمولہ آج بھی موجود ہے مگر اس کے توسط سے اردو کو برائے نام ہی فیض حاصل ہو رہا ہے، کیوں کہ تیسری زبان کے نام پر سنسکرت کو مسلط کر دیا گیا ہے۔ اس طرح مولانا کی منصوبہ بندی و دور بینی کا بنیادی مقصد ہی فوت ہو گیا اور ان کا خواب نامکمل رہ گیا۔ بقول امیر شکست و فتح تو نصیبوں سے ہوتی ہے مگر جہد مسلسل اور اخلاص نیت شرط ہے، اور مولانا سے اس باب میں بھی کوئی کوتاہی نہیں ہوئی۔

قصہ مختصر، اردو کے تئیں مولانا آزاد کی خدمات عالیہ سے انکار کفر ہے۔ اردو کے تعلق سے مولانا کی عطا اور ان کی عظمت کو سلام۔ بطور اختتام گفتگو علامہ روش کا یہ شعر مولانا کی نذر ہے جو ان کی شخصیت کی مکمل تفسیر کرتا ہے:

خامشی حکمت کوہ گراں کی صورت
گفتگو زمزمۂ جوئے رواں کی صورت

نوٹ: یہ مقالہ جامعہ اردو علی گڑھ کے ذریعے منعقدہ مولانا آزاد سیمینار میں پیش کیا گیا تھا۔

(مضمون نگار، اکیڈمک ریسرچ بیورو، نئی دہلی کے سربراہ ہیں)

●○●

بقیہ: مولانا آزاد اور اردو زبان کا تحفظ

دباؤ کے تحت علی گڑھ بھیجا تاکہ وہ اس دانش گاہ علمی کو حیات تازہ بخش کر سرسید کی وراثت کو باقی رکھیں، اس کی حفاظت کریں اور اس علمی درس گاہ کو ترقی کی راہ پر گامزن کریں، اور ایسا ہی ہوا بھی۔ اس طرح دراصل مولانا نے مسلم یونیورسٹی کی بقا کے دوام کا اہتمام، بڑی دانش مندی اور کمال تدبر کے ساتھ کیا تھا۔ جب ۱۹۴۹ء میں مولانا آزاد اس دانش گاہ کے جلسۂ تقسیم اسناد کی صدارت کے لیے علی گڑھ تشریف لائے تو تمام تلخیوں اور شکایتوں کو فراموش کر کے طلبہ کے سر پر اپنا دست شفقت رکھا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں فرمایا:

"سرسید نے علی گڑھ میں ایک کالج ہی قائم نہیں کیا بلکہ وقت کے جدید تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر اسے دانشوری اور ثقافت کا مرکز بنایا۔ انیسویں صدی میں ہندستان کی نشاۃ ثانیہ کا دور تھا، اور علی گڑھ اس کا سب سے بڑا مرکز۔ مستقبل کے مورخ علی گڑھ میں جدید ہندستان کی تعمیر کے ماخذ تلاش کریں گے، جو دروازے مقفل تھے اب کھل گئے ہیں"۔

(بحوالہ مجلہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ، جلد ۱۹، شمارہ ۲۱)

راقم الحروف کو یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ اگر ۱۹۴۷ء کے پُر آشوب دور میں مولانا آزاد جیسا ذی فہم اور بااثر قائد حکومت وقت کا بااختیار رکن رکین نہ ہوتا تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا وجود یا تو خدا نخواستہ باقی نہ ہوتا، یا اس شکل و صورت میں نہ ہوتا، جس میں آج ہے۔ وقت کے ساتھ نہ صرف اس کی نشو و نما ہوئی ہے بلکہ اس کے حسن و جمال میں مسلسل اضافہ ہوا ہے۔ ان اذکار کے ثبوت کی ضرورت یوں نہیں کہ اس دانش گاہ کی گزشتہ سرسٹھ برس

مولانا آزاد کے ایک ہم عصر مولانا دریابادی

(پہلی قسط)

اسیم کاویانی (فلیٹ نمبر 702، کیتن اپارٹمنٹ، بیلویدرے روڈ، مجگاؤں، ممبئی-400010)
E-mail: aseemkavyani@gmail.com

مولانا آزاد اور مولانا عبدالماجد ہم عصر تھے۔ اُن کی عمروں میں تین چار سال (مولانا آزاد بڑے تھے) کا ہی فرق تھا، پر مزاج و فکر میں بعد المشرقین تھا اور سعی و عمل کی راہیں بھی جدا تھیں۔ یہاں کوئی موازنہ مقصود نہیں، موازنہ ممکن بھی نہیں، اس کے لیے تو مماثلتیں دیکھی جاتی ہیں، یہاں تو تضادات کی جلوہ گری زیادہ ہے۔ اس مضمون میں ان اکابر کی سوانح اور تحریروں سے حاصل نتائج کی روشنی میں اُن کے تعلقات اور فکر و نظر کی دوریوں کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مولانا آزاد اور مولانا ماجد کی حیات و فن کے سرسری مطالعے ہی سے یہ نقش ذہن پر قائم ہو جاتا ہے کہ ایک کا دل و دماغ، علم و ادب کی وادیِ معرفت، شوق اور عشق کے جہاں آباد کرنے کے لیے بنا تھا، لیکن اسباب ایسے بنے کہ وہ لیلائے سیاست کو کعبۂ آرزو میں لانے اور دین کی کلاہِ امامت کو افتخارِ سر بنانے کا خواہاں رہا۔ دوسرے نے مغرب کے فکر و فلسفے کا جادہ چھوڑ کر شرق و شریعت کے کوچے کی سیر کو پسند کیا۔ ایک دین کی راہ پر چل کر وحدتِ ادیان کا جویا ہوا، دوسرا الحاد کے دام سے نکل کر دین کی پناہ میں پہنچا۔ ایک نے اپنی دین فہمی سے عقل و خرد کو شریک و سہیم بنایا، دوسرے نے اپنی دین پرستی سے عقل و خرد کو سبک سر کرنے کی کوشش کی۔ ایک نے قوم کے ساز پر بیداریِ روح کا نغمہ چھیڑنا چاہا، لیکن کیفیت یہ رہی کہ ع ترا دے کہ تکلید بسازی خواہم! دوسرے نے لوگوں کے بیچ اُن کی سی کہی اور وہ 'باتیں' لوگوں کو اپنی سی لگیں۔ ایک کی زندگی اگر امتحان تازہ ہی خواہم کہ در کاوش کم کی مثال رہی تو دوسرے نے یہ کہا کہ ع

گر وقت ورزش خدا را بہانہ ساختہ!

مولانا آزاد 1904 تک ماہ نامہ 'نیرنگ عالم' (کلکتہ)، ہفت روزہ 'مصباح' (کلکتہ)، ایڈورڈ گزٹ (شاہ جہاں پور)، ہفت روزہ 'احسن الاخبار' (کلکتہ)، ماہ نامہ 'خدنگ نظر' (لکھنؤ) اور ماہ نامہ 'لسان الصدق' (کلکتہ) کی ادارت یا ترتیب کے تجربوں سے گزر کر کل وقتے سے لے کر اخبار و جرائد تک کی صحافت کے متنوع رنگوں سے آشنا ہو چکے تھے۔ درسِ نظامی کی تکمیل اور علومِ متداولہ کی تحصیل کر چکے تھے۔

'لسان الصدق' نے اُس دور کے سربرآوردہ ادیبوں کو اُن کی طرف متوجہ کروا تھا۔ 1904ء ہی میں جب علامہ شبلی پروفیسر آرنلڈ کو الوداع کہنے کے لیے بمبئی آئے تھے تو مولانا آزاد کی اُن سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ علامہ شبلی اس کم سنی (پندرہ سولہ سال کی عمر) میں اُن کے وسیع مطالعہ اور ایسی جدید عربی مطبوعات تک رسائی دیکھ کر حیران رہ گئے تھے، جن کا انھوں نے صرف نام ہی سنا تھا۔ انھوں نے مولانا آزاد کو لکھنؤ آکر 'الندوہ' سنبھالنے کی دعوت دی تھی، جس کے لیے مولانا اُس وقت راضی نہ ہوئے تھے۔

اپریل، مئی 1905 کا مشترکہ شمارہ 'لسان الصدق' کا آخری شمارہ ثابت ہوا تھا۔ اُدھر علامہ شبلی نے انھیں دوبارہ بالاصرار لکھنؤ آنے کی دعوت دی تھی اور وہ خود حیدرآباد کی ملازمت سے سبک دوش ہو کر ندوے جا رہے تھے جہاں معتمد تعلیمات کی حیثیت سے اُن کی تقرری ہوئی تھی۔ آخر مولانا آزاد بھی لکھنؤ پہنچے، جہاں وہ علامہ شبلی کی نگرانی میں اکتوبر 1905 سے مارچ 1906 تک 'الندوہ' سے بطور نائب مدیر منسلک رہے۔ اسی دور میں 'الندوہ' کے پرچوں سے مولانا ماجد پہلی بار مولانا آزاد کے نام سے واقف ہوئے تھے۔ [1] اُس وقت وہ غالباً دسویں جماعت میں پڑھ رہے تھے۔

مولانا ماجد نے 1909 میں ایک بار لکھنؤ ریلوے اسٹیشن پر سیکنڈ کلاس (آج کل کے فرسٹ کلاس) ویٹنگ روم سے "...ایک گورے چٹے، خوش رو، جامہ زیب، کشیدہ قامت، چھریرے بدن کے، سیاہ شروانی اور ایرانی ٹوپی میں ملبوس جوان رعنا کو سگریٹ پیتے نکلتے دیکھا، پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ کسی نے کہا کوئی ایرانی پرنس معلوم ہوتا ہے۔ آخر کو کھلا کہ یہی ابوالکلام آزاد ہیں۔" [2] اُن کی شخصی طور پر مولانا آزاد سے پہلی ملاقات 1911 میں ہوئی تھی۔ یہ وہ موقع تھا جب مولانا آزاد علامہ شبلی کے یہاں مہمان آئے ہوئے تھے اور غالباً اُس وقت مولانا ماجد، علامہ شبلی کی معرکہ آرا تالیف 'سیرت النبی' کے پروجیکٹ کے عملے میں انگریزی مواد کے مترجم کی حیثیت سے پچاس روپے ماہوار پر مامور تھے۔ بے جا نہ ہوگا اگر علامہ شبلی سے اُن کے متعارف ہونے کا دل چسپ پس منظر یہاں واضح کر دیا جائے۔

لکھنؤ کے ماہ نامے 'الناظر' میں علامہ شبلی کی تالیف 'الکلام' پر مارچ تا نومبر 1910 کے درمیان پانچ قسطوں میں ایک سخت تنقیدی مضمون چھپا تھا، جس میں مضمون نگار نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ علامہ شبلی کی تاریخ سے فطری مناسبت میں تو کلام نہیں، لیکن وہ فلسفے سے کامل واقفیت رکھتے ہیں نہ ہی مغربی زبانوں سے واقف ہیں اور اُنھوں نے عقل اور مذہب میں مطابقت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ 'الکلام' اُن کے علمی کارناموں پر ایک بدنما داغ ہے۔ یہ مقالہ مولانا ماجد نے 'ایک طالب علم' کے پردے میں لکھا تھا اور عذر پیش کیا تھا کہ:

صلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز

علامہ شبلی نے کھلے دل سے 'طالب علم' کے حوصلے کی داد دی تھی اور مولوی ظفر الملک علوی (ایڈیٹر 'الناظر') سے مولانا ماجد سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور یوں ایک ذہین طالب علم اپنے وقت کے جید عالم اور باکمال ادیب کے دامنِ صحبت سے وابستہ ہو گیا تھا۔

1912 کے آخری دنوں میں لکھنؤ کے قیصر باغ کی بارہ دری میں مسلم یونی ورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کا فیصلہ کن اجلاس جاری تھا۔ ارباب علی گڑھ کا اصرار تھا کہ یونی ورسٹی جن شرائط پر بھی ملے، لے لینا چاہیے۔ اُدھر آزاد خیالوں کا مطالبہ تھا کہ یونی ورسٹی قوم کی شرائط پر قبول کی جائے، ورنہ نہیں۔ اس نقطۂ نظر کے سرگروہ مولانا آزاد تھے اور اس کے برعکس کے مولانا محمد علی، اگرچہ اُنھوں نے کھل کر اپنا موقف واضح نہیں کیا تھا۔ ان اکابر کی پہلی ملاقات مجوزہ یونی ورسٹی کی تحریک ہی کے سلسلے میں 1904 میں احمد آباد کے اجلاس میں ہوئی تھی۔ جب مولانا آزاد سے عمر میں دس سال بڑے مولانا محمد علی نے جنوری 1911 میں کلکتے سے ہفت روزہ 'The Comrade' جاری کر کے قومی صحافت میں بھی اپنی شناخت بنالی تھی۔ ہر کیف قیصر باغ کی بارہ دری میں ایک اعتبار سے مسلمانانِ ہند کے مستقبل کی حکمت لیڈرشپ کے دو انتخابی باصلاحیت، ذہین اور پرجوش امیدواروں کا آمنا سامنا تھا۔ دن بھر کی بحثوں سے تو مولانا آزاد کے موقف کی حمایت نظر آئی، حتیٰ کہ 28 اور 29 دسمبر کی درمیانی شب میں دوسرے دن کے اجلاس کا ریزولیوشن اور الاتفسرانے سے ملنے والے ممبران وفد کی فہرست تک نواب وقار الملک کی موجودگی میں تیار ہو گئی۔ اس اجلاس کے ناظر مولانا ماجد کے بموجب "...وقت پر محمد یاغیوں کے سردار مولانا ابوالکلام آزاد کی فتح مندیوں کو نمایاں کرتا جا رہا تھا۔" "لیکن آدمی رات کو حریف گروہ نے کچھ لوگوں کو بہلا کر بازی پلٹ دی۔ ممبران کی فہرست تک بدل ڈالی۔ صبح ہوئی تو میدان 'ایڈیٹر کامریڈ' کے ہاتھوں میں تھا۔ بقول ماجد"... یہ محمد علی کی لیڈری کا پہلا امتحان تھا... وہ کامیاب ہوئے اور بلکھنوؤں کی پیشانی پر بل پڑ چکے۔" [3] اس دن سے لے کر دم آخر تک مولانا ماجد نے غیر منقسم ہندستان کی مسلم لیڈری کا تاج مولانا محمد علی کو پہنائے رکھا اور اس میں کبھی فرق نہیں آیا۔

13 جولائی 1912 کو کلکتے سے اُفق سے مولانا آزاد کا ہفت روزہ 'الہلال' طلوع ہوا اور پہ جلال بدر کامل راس کی ضیا پاشیوں نے دنیائے صحافت کو منور کر دیا۔ دسمبر کا لکھنؤ کا قضیہ 'الہلال' کی 1913 کی فائلوں میں نمایاں طور پر چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ 25 اگست 1912 کے 'الہلال' میں ایڈیٹر 'الہلال' نے اپنے مضمون 'لوذ شام کی نصف شب' میں

(بقیہ صفحہ 7 پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: شمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ) دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org